

کمال العصر

دورنی اپنی تانی اور ماموؤں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مرجکی ہے۔ گھر میں دو ماموں، ممانی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپس میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عبادان کا بیٹا ہے۔ جو دورنی کو چاہتا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے زیر کرتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔ بی ذی ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ تانی دورنی کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔

لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آ جاتی ہے۔ پولیس کا نام سن کر بی ذی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے بر سکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر امیر علی اپنے جونیئر قاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو ترقی دور کشاب میں مدعو کرتا ہے۔ قاروق احمد حوڑا آج ہے۔ عباد، دورنی کو پڑھانے آتے ہیں، دورنی بتاتی ہے کہ وہ کبائٹ امتحان دے رہی ہے، اور اسے ہر بجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شونا کی شادی ہوتی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کر دیا جاتا ہے، بانی انتہائی کم عمر ہے۔ شاکر فیروزہ کا بڑا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے ہیں۔

فیروزہ کا چھوٹا بیٹا عامر بہت خود مر ہے۔ وہ عیسیٰ سے بہت چڑتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر عیسیٰ کو بالکونی سے الٹا لٹکا دیتا ہے۔ دورنی کو دوسرا ب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوتی ہے عیسیٰ سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔

بی ذی کو آتش فون کر کے اطلاع دیتا ہے کہ وہ بی وی آن کر کے دیکھے علائقہ سے متعلق خبر آ رہی ہے۔ چتا ہے کہ علائقہ کی لاش اس کے قلیٹ سے بڑا مد ہوئی ہے۔

دورنی پیپر دینے خوب تیار ہو کر جاتی ہے، اسے مقابچ چھوڑنے جاتا ہے، والدہ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایٹا عامر سے کہتی ہے کہ عیسیٰ سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروادے۔ سید صاحب کو جب سے عامر نے عیسیٰ کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سرکٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔

دورنی جلدی سے پیپر ختم کر کے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔ آتش چند روز کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہے خولہ کو موقع مل

جاتا ہے کہ وہ فون کر لے وہ فون کرتی دوسری طرف فون اٹھالیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر ملاتی ہے اس وقت کوئی اسے آواز دیتا ہے۔

کریفہ سہراب کی دعوت کرتی ہیں اور بظاہر اسے گھیر لیتی ہیں، وہ دلی ہی دل میں ان کے بے وقوف بن جانے پر ہنستا ہے۔ فاروق احمد، امیر علی خان سے کہتا ہے کہ علائقہ خان کے قتل کے تانے بانے آتش کدہ سے ملے ہیں۔

عامر، عیسیٰ سے پوچھتا ہے کہ اس نے اس کا کام کرویا عیسیٰ کے منع کرنے پر وہ اسے ڈانٹتا ہے۔ فیروزہ عامر کو سخت ستاتی ہیں اور عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ عیسیٰ واپس آتا ہے تو وہاں سے اس کا جرم عائب ہوتا ہے۔

بی ڈی اپنا پروموشن ٹرپ کر کے واپس آتی ہے تو اس کے دوست پارٹی رکھتے ہیں پارٹی میں اس کو ایک فون آتا ہے۔ وہ علائقہ خان قتل میس کے سلسلے میں بی ڈی سے بات کرتا چاہتا ہے۔ بی ڈی خوف زدہ ہو کر لائن کاٹ دیتی ہے۔

شمار کی بیوی فرح عیسیٰ اور عامر کی بحث کو بڑھا چڑھا کر جھگڑے کی شکل میں شوہر تک پہنچا کر کہتی ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو اس ماحول سے بچا کر الگ ہونا ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی سے کہنیز ایا امریکا جانے کے سلسلے میں بات کا کہتی ہے۔

دوری ریڈ سوٹ میں سہراب سے ملنے آئی تھی وہ اسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتا ہے۔ دوری حامی بھر لیتی ہے۔ سہراب بہت خوش ہوتا ہے اسی وقت گاڑی کے سامنے عیسیٰ آ جاتے ہیں۔ دوری ڈر جاتی ہے۔ عامر پانی سے ٹل کر ماں اور عیسیٰ کی شکایت کرتا ہے۔ بانی اپنی کم عمری کی شادی اور عیسیٰ شوہر کی وجہ سے پہلے ہی ناراض تھی۔ دوری بھاکم بھاکم کہتی ہے۔ گھر میں سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ خاقان سر آتش سے اچھی لڑکی کے فون استعمال کرنے کی شکایت کرتا ہے۔ نمبر نوٹ کرنے پر آتش اسے سخت ستاتا ہے۔

سہراب دوری کے قتلے پر غصہ ہوتا ہے۔ اسے فکر ہوتی ہے کہ عیسیٰ نے اپنے گھروالوں کو سب بتا دیا ہو۔



دوڑی رجا سے بات کرتی ہے۔

اکیسویں قسط

اے رب
اے کل جہاں کے رب
اے امین مسلمان کے رب
میں تیری کن کا مسخر
بھگ رہا ہوں مگر مگر
ہر گام ہر دھڑکی
نہیں آتی خود اپنی خبر
ہے کیا آخر یہ معاملہ
دے پھرتو مجھ کو بھی خبر
میں تیری کن کا مسخر

☆☆☆

”یہ..... آواز۔“ وہ برق رفتاری سے پلٹ کر دیکھنے کی خواہاں ہوئی تو ضرور مگر اپنی خواہش کو فی الفور عملی جامہ پہنانے کے بجائے ایک لمحہ توقف کرتے ہوئے بڑی پھرتی سے دوپٹے کے پلو سے اپنا نصف چہرہ ڈھانپ کر آواز کی سمت گھومی۔

”بی دی؟“ اس کے حلق سے بمشکل تمام مری مری سی آواز برآمد ہوئی۔
”جی مجھے، بی۔ فی سے ملتا ہے۔“ جواب میں حجاز جھکار سے ڈھکے پتھر لیے چہرے اور بے روح نگاہوں والے دشمن نے نسبتاً ابتداً آواز میں اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”آپ اندر اطلاع کر دیجئے کہ شرر ملنا چاہتا ہے۔“
”شش..... شش..... شرر! اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ چکر اکر بیہوش ڈھیر ہو جائے گی۔ اور واقعاً ہو بھی جاتی اگر ایک دم دوبار کا سہارا نہ لے لیا ہوتا تو۔“

”عالباب! آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔“ وہ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر زاویہ نظر تبدیل کرتے ہوئے ہمدردی سے بولا۔

”صاحب! اس کی طبیعت نہیں۔“ تب ہی رضیہ، جو تاحال صوفی کی پشت پر ایستادہ تھی، ایک دم زہر خند سے لہجے سے گویا اسے مطلع کرتے ہوئے بولی۔ ”بلکہ اس کا دماغ خراب ہے۔“

”تو ان کے بجائے بی بی سڈی کو آپ میری آمد کی اطلاع دے دیجئے۔“ وہ خشک سے لہجے میں بولا کہ اسے ان دونوں کے مابین جاری خالصتاً زمانہ سرد جنگ سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

”جی.....“ رضیہ منہ بنا کر بولی۔ ”متا جاتی ہوں انہیں جا کر۔“

”بہتر ہے۔“ اس نے مختصر کہا اور پشت پر ہاتھ باندھ کر لا اعلیٰ سے سامنے دوبارہ کودیکھے گیا۔
تب وہ دوبارہ ہی کے سہارے آگے بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ راہداری کے اختتام پر پہنچ گئی اور آگے بڑھنے سے پہلے اس نے ایک بار مڑ کر دوبارہ دیکھا تھا۔

☆☆☆

”یہ تاؤ، کمرے میں پینٹ کس رنگ کا ہونا چاہیے؟“

تاروں کی چھاؤں میں بے متنی سے قدم اٹھاتا، دایاں ہاتھ پہلو میں گرائے، بائیں ہاتھ میں موجود سم قاتل کولیوں سے لگائے وہ چلا جا رہا تھا۔ اس پاس کے مناظر کچھ بہ کچھ بالکل اسی طرح تبدیل ہوئے جاتے تھے، جیسا کہ چند برس قبل اس کی زندگی.....

ریتا کے فیروزہ کو مٹا لینے کے بعد کے سارے مراحل بہت آسانی اور تیزی کے ساتھ طے ہوتے چلے گئے تھے اور ان دنوں ان کی شادی کے حوالے سے گھر میں تیاریوں کا سلسلہ تھا..... اور اس وقت خوشی سے بے حال عامر ریتا کے گھر کے مہمان خانے میں، اس کے بالقابل برادر بھائی، شہار بھوجانے والی نظروں سے اسے دیکھتا بڑی لگاؤ سے استغفار کر رہا تھا۔ تب ہی حاشیہ رنگ کے جوڑے میں بیٹوس ریتا، جس کا سارا انہماک شعوری طور پر اس وقت ڈیزھڈیزہاچ لیے ناخنوں پر لگی آنٹی گلابی نیل پالش پر تھا۔ وہ ناخنوں سے نظر ہٹا کر اسے بڑے مسخرے سے دیکھ کر بولی۔

”کمرے میں پینٹ بعد میں کر لیتا، پہلے اس شانی کا تو کوئی بندوبست کرو۔“

”کیا مطلب؟“ وہ جو اس شہلو جو الہ پر جان دارنے کو بے تاب بیٹھا تھا یک یک کچھ پریشان سا ہو کر بولا۔

”مطلب صاف ہے۔“ وہ غریبے لہجے میں بولی۔ ”میں کسی حد تک موجودگی میں شادی نہیں کروں گی۔“

”یہ کیا بات کر دی بار۔“ وہ دلربا کی اس غنی فرمائش پر ذرا کڑوا گیا۔ ”اتنی جلدی اس کی شادی کیسے ممکن ہوگی؟“

”کیسے ممکن ہو، مجھے نہیں پتا۔“ وہ زروٹھے پن سے بولی۔

”بات سمجھنے کی کوشش کر رہا۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔ ”اس کا تو ابھی تک کہیں رشتہ بھی طے نہیں ہوا ہے جب کہ ایک مہینے بعد ہماری شادی طے ہو چکی ہے۔“

”ہاں تو ایک مہینہ بہت ہوتا ہے۔“ وہ نہ ماننے والے لہجے میں بولی۔ ”جب تک ڈھونڈ لو اس کے لیے کوئی رشتہ۔“

”جی“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”یہ کسی خند ہے ریتا۔“

”میں خند کر رہی ہوں؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پوری کھولتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”یہ خند نہیں، بس میری خواہش ہے عامر صاحب اور جیسے پورا کرنا آپ کا فرض ہے۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے جان!“ وہ اسے منانے کی خاطر جلدی سے اس کے نزدیک آ بیٹھا۔ ”پر یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”مجھے بھولی جانا تو آسان ہو گا نا۔“ وہ اس کا بڑھتا ہاتھ بری طرح جھٹک کر بولی۔ ”تو بس مجھے بھول جاؤ۔“ اس نے درستی سے کہا اور پھر فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

عامر بڑی مصیبت میں پڑ گیا تھا۔ پر یہ غم یا ریتا۔ اسے بجالانے کا اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

”یہ بات تو صاف ہے کہ اس نے لا رہے لگائے ہیں لڑکی کو.....“

ریتا نے بہت عرق ریزی سے بساط بچھاتے ہوئے، درمی اور عیسیٰ کا رشتہ جوڑنے کے حوالے سے اولاً

عامر کی ذہن سازی کی تھی۔ بعد کے مراحل نسبتاً آسان ہوں تھے کہ اب اسے اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عامر کا بھرپور ساتھ میسر تھا۔ جس نے آج گھر میں ساری بہنوں کو یک جا کر کے سچھری لگا رکھی

تھی..... اور خود بے نقط بو لے چلا جا رہا تھا۔

”تب ہی تو اس کی ممائی دن رات، اسے فون کر کر کے دماغ چاٹ رہی ہے کہ رشتہ لاؤ..... رشتہ لاؤ۔“

”ہمیں تو کچھ کچھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے؟“ عامر کے خاموش ہونے پر، بھاری سچے اور سنجیدہ

چہرے والی شونائے تشویش سے لب کشائی کی۔

”صاف صاف تو بتا رہا ہوں۔“ عامر نے انہیں ٹھوکر دیکھا۔ ”پھر بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آ پارہا۔۔۔۔۔“

”ہائے چوٹا۔“ بالی، کہ جس کی سن رسیدگی نے اس کی ہم و فراست کا بال تک بیکا کرنے کی جرات نہ کی تھی،

دہائی دینے والے لہجے میں سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”خاندان کا عزت خاک میں ملا دینے۔“

اس کے اس جھلے پر ساتھ ساتھ براجمان، بادقار، شخصیت میں ڈھل جانے والی تھی اور اعتماد سے عاری مگر پختے سے متحمل دکھائی دینے والی شانی نے بے ساختہ ایک دوسرے کی جانب دیکھا تو ضرور مگر کسی بھی قسم کے

تبرے سے گریزی کیا پر عامر چمک کر بولا۔

”اسی دن کے لیے ائی کو ٹوٹا تھا کہ اس کی ہر جائز ناجائز بات مت مان جایا کریں مگر نہیں۔۔۔۔۔ اپنے بابو کو

اجسی طرح کا ذکر خود تو چلی گئیں اور یہ اب ہمارے سر۔۔۔۔۔“

”آگے کا بتاؤ۔“ تھی چوں کہ واقف تھی کہ وہ اب والدہ مرحومہ کے کردہ، ناکردہ گناہوں کا کھانا کھول کر

پینہ جائے گا، جب ہی اکٹھا ہٹ سے اسے درمیان ہی سے ٹوکتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ ”اب کیا کرنا ہے۔“

”اس کی محبوبہ کا رشتہ لے کر جانا ہوگا۔“ وہ تھی کے ٹوکتے پر ناگواری سے ماتھے پر ٹل ڈال کر بولا۔

”اور کیا کرنا ہے۔“

”مگر ایسے کیسے۔۔۔۔۔“ شونا پریشانی سے بولی۔ ”نہی تو تعلیم بھی اس کی نامکمل ہے اور نہ ہی اس کے پاس

ڈھنگ کی کوئی ملازمت ہے۔“

”اب یہ سب تو اسے عشق لڑانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا نا۔“ رینا جیسے اعزاز سے ہنس کر بولی۔ اور وہ

ساری یوں شرمندہ ہو گئیں گویا جیسی کا عشق ان ہی کا گناہ ہے۔

کسی ایک کے ذہن میں بھی اس وقت رینا کو یہ جتنے کا خیال نہ آیا کہ عشق و عاشقی کرتے وقت ان

”سنجیدہ“ نکات پر سوچنے کا خیال تو انہیں بھی نہیں آیا تھا بہر کیف۔

”اس لڑکی کی ممانی رشتہ نہ لانے کی صورت میں، سارے خاندان کو عین نتائج بھگتنے کی دھمکی دے گئی

ہے۔“ رینا نے مزید بتایا۔

”ارے باپ۔۔۔۔۔“ بالی خواہ مخواہ ضرورت سے زیادہ دھل کر بولی۔ ”پھر تو رشتہ لے کر جانا ہی پڑے گا نا۔“

”ایسے کیسے رشتہ لے جانا پڑے گا۔“ تھی نا پسندیدگی سے بولی۔ ”پہلے ہم یہی بات کریں گے۔“

”اس سے کیا بات کرنی ہے۔“ عامر جریز ہو کر بولا۔ ”وہ تو صاف ٹکر چکا ہے۔“

”وہ اگر ٹکر چکا ہے، تب ہمارے پاس اس کا رشتہ لے جانے کا کیا جواز ہے؟“ تھی نے بغور عامر کو دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

”اب یا تو ہم لوگ جواز تلاش کرتے پھریں یا پھر اپنے باپ دادا کی عزت بچالیں۔“ عامر تھی کی جرح پر

دانت کچکا کر بولا۔

”تھی! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ شانی گڑبڑا کر جلدی سے بولی کہ اس لفظ ”عزت“ پر ہمیشہ ہی اس کے

اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ ”عامر بھائی بالکل ٹھیک کر رہے ہیں۔ عیسیٰ نے لڑکوں کی عادت کے مطابق یوں ہی

دل لگی کی ہوگی۔ وہاں معاملہ سنجیدہ ہو گیا۔ اب اگر اس نے غلطی کی ہے تب ہم سب اسے مل کر سمجھانے کی کوشش

کریں گے نا۔“

”میں مثنیٰ بریانی بخوار ہی ہوں، آپ سب رات کا کھانا کھا کر جائیے گا۔“

ان ساروں کو سوچا میں پڑاؤ کیہ کر رہا ہوں کہ اس کے سارے ہی تیرنی الحال نشانے پر جا لگے تھے۔

کی مکھی اس وقت خود کار چنگ کا سر ہاند اونچا کیے بستر پر نیم دراز اپنے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک وزنی اور موٹی سی طلائی زنجیر پھسائے اسے اپنے چہرے کے سامنے فضا میں ذرا سا بلند کیے، اس کا ننھے ننھے زرقونوں سے جھللاتا طلائی ٹکے ٹرا پیڈنٹ دیکھنے میں بے طرح منہمک تھی کہ جب رضیہ نے آ کر اسے شرکی آمد کی اطلاع بہم پہنچائی۔

جواباً اس نے سر کے خفیف سے اشارے سے اسے اندر بھیج دینے کا عندیہ دے دیا۔ جب رضیہ ایک حسرت آمیز لپٹائی سی نگاہ اس لاکٹ پر ڈال کر بڑے بڑے دل سے واپس باہر آئی اور بی ٹکی کا حجاب باہر ہنتر کھڑے شرابگ پہنچا کر وہاں سے چل دی۔

شرر حسب عادت دستک دے کر کمرے میں داخل ہوا اور ساتھ ہی اس پر سلامتی بھیجی۔ مگر اس کے انہماک میں سر ہر فرق نہ آیا، گویا اس نے سنا ہی نہ ہو۔

”کیسی ہو بی مکھی؟“ وہ چلنا ہوا سونے اور چنگ کے درمیان والی جگہ پر آٹھرا۔ وہ پھر بھی متوجہ نہ ہوئی تو اس بار اس نے ذرا تشویش سے اسے پکارا۔

”بی مکھی؟“

”ہاں!“ اس بار بڑے بھر پور انداز سے جوتکھتے ہوئے بی۔ ڈی نے اس کی کار کی سمت دیکھا تھا۔
”میں پوچھ رہا ہوں، اب کبھی طبیعت ہے تمہاری؟“ بی۔ ڈی کی جانب دماغی کو محسوس کرتے ہوئے نرمی سے استفسار کیا تھا۔ جواباً وہ انگلیوں میں لپٹی زنجیر اس کے سامنے کرتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

”یہ لاکٹ دیکھ رہے ہو؟“

دیکھ تو ظاہر ہے وہ رہا تھا مگر اس کے درمیان جو تامل لکھا تھا، وہ دور سے واضح نہیں ہو پا رہا تھا، سو اس نے ذرا نزدیک جا کر بنور دیکھنے کی کوشش کی اور.....

”بی ٹکی؟“ وہ سرعت سے ایک قدم یوں پیچے ہٹا جیسے آگے کسی کھائی میں گر جانے کا اندیشہ ہو اور بڑے حیرت آمیز تعجب سے بی۔ ڈی کو دیکھے گیا اندرونی احساسات چہرے پر ایک ہل کو ظاہر ہو کر یک تاثرات سے یک سر بے نیاز خود کلامی کے سے انداز میں اپنی ہی کہنے میں مگن تھی۔

”یہ مجھے میری نالی نے دیا تھا..... سب کہتے تھے، میں ان کی لاڈلی ہوں۔ وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔ پر یہ بات غلطی شرر۔“

اس کی آواز انجانے سے جذبات کی پلنگار کے سبب بھڑانے لگی۔ ”کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی بھی انسان کسی دوسرے سے اتنی محبت کر ہی نہیں سکتا جتنی کہ ”یہ“ کرتا ہے۔“

پتا نہیں وہ یہ سب اس سے کیوں کہہ رہی تھی؟

پراسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ اس کے دل پر بڑی کاری ضرب لگاتا چلا جا رہا تھا۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اسے خاموش کر دے مگر.....

”جانتے ہو شرر.....“ اب وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔ ”میں شروع سے خود تھی۔ کبھی کسی اپنے کی بات نہیں مانی۔ پھر سب نے میرا ساتھ چھوڑ دیا مگر یہ۔ یہ دیکھو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ یہ اب بھی میرے ساتھ ہے اس نے مجھے نہیں چھوڑا۔“

”لا یعنی باتیں سوچ سوچ کر کیوں اپنے ذہن کو تھکارتی ہو بی لڑکی۔“ بالآخر اس کے اضطراب نے پھر کر اس سے کھلوائی دیا۔

”لا یعنی؟“ اس نے شکایتی نظروں سے شرر کو دیکھا۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ میرا وجود ہی لا یعنی ہے۔“
”تم ایک خوف ناک حادثے سے گزری ہو۔“ وہ اپنے اندر کی بے چینی سے نگاہ چاکر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری یہ کیفیت اسی حادثے کی دین ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے سوشل میڈیا یا کاؤنسل پر دوبارہ متحرک ہو جاؤ۔ وہاں مصروف ہو جاؤ گی تو ان بے کار سوچوں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔“

”شاید.....“ اس نے شرر کے مشورے پر بے بسی سے اپنا سر تکیے پر رکھے ہوئے کہا۔ ”تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ دن رات یہاں تنہا بڑے بڑے میں اور یہ سٹو ہو گئی ہوں۔ اسی لیے اور محسوس ہو رہی ہوں۔“

”بالکل یکساں بات ہے۔“ وہ کچھ اس شدت سے اس کی بات کی تائید کرتا ہوا بولا گویا دل میں کہیں اسے جھٹلانے کا خیال واضح ہو رہا ہو۔

”اب تم جاؤ.....“ وہ دھمکانہ دوسری طرف پھیر کر زوٹھے پن سے بولی۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“ وہ ترنت بولا کہ خود بھی فی الفور یہاں سے روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ ”اب تم آرام کرو۔“ وہ کہہ کر سرعت سے کمرہ عبور کر گیا۔

تب بی بی نے دامن صحنی میں موجود اس لاکٹ کو زور سے بھینچا اور ایک بار پھر رونے لگی۔ یہ اور بات کہ اب اس کے آنسوؤں کا رنگ کچھ بدلا بدلا سا تھا۔

☆☆☆

”نفی خدار اتم ای کو بھجواؤ، مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔“
وہ آہستگی سے چٹا گلی کا موٹر مڑ گیا تھا، تب ہی ایک کمر کی چھت پر لگے زرد و بنر شامیانے سے انٹھی دھوک کی آواز نے اس کے قدموں کو زنجیر کر لیا۔ اس گھر کے دروازے والے اتھے اور دو جوان اپنی عمرانی میں دھکیں اندر دھکوارہ تھے جب کہ کمر کے باہر کرسیاں ڈالے لگے کپڑوں میں چند بزرگان براجمان تھے اور اطفال بے قرار بے مقصد پوری گلی میں یہاں سے وہاں کد کڑے لگاتے پھر رہے تھے۔
مترنم قہقہے، شادمانی، رنگ و بو یعنی ایک تقریب سعید کے سارے ہی لوازمات یہاں دکھائی دیتے تھے۔
اس کے لیوں پر ایک اداس تبسم آئینہ اور ذہن خود بخود پیچھے کی جانب محو سفر ہو گیا۔
یہ شادی کی شادی سے چند روز قبل کا منظر تھا۔

شانی کا برقع کش چہرہ شدت گریہ سے سرخ پڑ چکا تھا اور وہ اپنے گھٹنوں پر سر رکھے یاسیت و بے بسی کی تصویر بنی اپنے پنگ برقع کشی کی کہ تب ہی چہرے پر بوج آئینہ نظر لیے مٹی اندر داخل ہوئی، جسے سامنے دیکھ کر شانی مائی بے آب کی مانند تڑپ کر اس سے متحیرانہ لہجے میں بولی گئی۔ ”امی کو سمجھائیں آپ۔“
”تم کیا خیال کرتی ہو؟“ نفی اس کے نزدیک بیٹھ کر رنجور سے لہجے میں بولی۔ ”میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی ہوگی؟“

”پھر؟“ وہ بے قراری سے متفر ہوئی۔ ”پھر کیا کہتی ہیں وہ؟“
”وہ کیا کہیں گی؟“ نفی بہت کچھ ”مٹی آنکھوں“ سے دیکھ رہی تھی، سو گمبیرتا سے بولی۔ ”عامر نے انہیں بے بس کر دیا ہے۔ اور پھر توجہ تو یہ ہے کہ اب روپے پیسے کا بھی مسئلہ ہے چنانچہ سب بھی چاہ رہے ہیں کہ ایک کے خرچے میں دو شادیاں منٹ جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔“

”ہمارے ہاں دم بے پیسے کا مسئلہ ہے؟“ اس سناری بات میں سب سے زیادہ تعجب خیز اسے یہی الفاظ

معلوم ہوتے تھے سوچی کو یوں دیکھ کر بولی گویا نفی اسے سورج مغرب سے طلوع ہونے کی اطلاع دے رہی ہو۔
اور یہ خبر واقعتاً ان جیسوں کے لیے سورج مغرب ہی سے طلوع ہونے کے مترادف تھی پر انہیں سمجھنے میں
بڑی دیر لگی۔

”ہاں شانی“ نفی کی آنکھوں کی سطح نم ہو گئی۔ ”صورت حال بہت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔ بھائی جان
ایک مہی بندگی رقم ای کے کو تھماتے ہیں اور چھوٹے بھائی جان نے بھی بھیجی جانے والی رقم میں پچاس فیصد کنوٹی کر دی
ہے۔“ چوں کہ ”پچاس فیصد کنوٹی“ کا پس منظر اب ان سب ہی کے علم میں تھا سو وہ چپ کی چپ رہ گئی۔
”پھر ابھی ظاہر اور بھی کی پڑھا لی جاتی ہے۔“ نفی ایک لحظہ توقف کے بعد حریذ بولی۔ ”اور عامر کا حال
تمہارے سامنے ہے۔ اسے صرف اور صرف کسی بھی طرح بس اپنی شادی کروانے سے غرض ہے۔“
”ہاں۔“ شانی مسلسل بہتے آنسوؤں کو بائیں ہاتھ کی پشت سے رگڑتے ہوئے بولی۔ ”اور ان ہی کے زور
دینے پر بالی باجی میرے لیے اپنی کسی دور پار کی سند کے گھر سے یہ رشتہ لے کر آ گئی ہیں۔“
”ہاں تو دشمن محوڑی ہیں مگر بے پایہ۔“

بالی جو عامر سے تازہ بہ تازہ کوئی ساز باز کر کے سرورسی چال چلتی کرے میں داخل ہو رہی تھی، قابل دید
اطمینان سے بولی۔

”تب ہی تولائے ہیں نے تمہری خاطر اتنا بڑھ چاہی رشتہ۔“

”عامر بھائی کو شادی کرنی ہے تو کر لیں۔“ شانی نفی سے بولی۔ ”وہ میرے پیچھے کیوں بڑگئے ہیں۔“

”پچھا پڑنے کا، کا بات ہے۔“ اس آنا کا تاہونے والی شادی کے صتب میں پوچھیدہ عوامل سے پردہ تو عامر
نے بالی کے سامنے بھی نہ اٹھایا تھا۔ بس اتنا ہی کہا کہ اچھا ہے جو اس دن بدن بڑھتی مہنگائی میں ”دو“ کے بجائے
ایک ہی خرچا کر لیا جائے تو۔ سو بالی مدد دینی بن کر اسے سمجھانے کی غرض سے بولی۔ ”سب بس یہی چاہ رہے ہیں
نے کہ تم دونوں کا کھانا ایک ہی ساتھ کر لیا جائے۔“

”اور اس ایک ہی کھانے کے چکر میں چاہے میری زندگی ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے؟“ وہ اپنی بے وقفی پر
بہت دکھ سے بولی۔

”سب جانتے ہیں ہم۔“ اب یہ رشتہ تو ظاہر ہے کہ وہی لے کر آئی تھی۔ سوز ندگی تباہ ہو جانے والی بات
اسے بھالے کی طرح لگی تھی، سو جیلا کر تیز لہجے میں بولی۔ ”تمہیں یہ پتا نہ ندگی تباہ ہو جانے کا خیال کیوں ستا
رہا ہے۔“

”کیوں ستا رہا ہے؟“ نفی نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھ کر پوچھا۔

”کیوں کہ ان کا وہ ندیموا (ندیم) اڑن کھولے (ہوائی جہاز) میں بیٹھ کر کویت جو جا رہا ہے۔ ان کا
(انہیں) انتظار کرنے کا کہہ گیا ہو گا۔“ اس کی معلومات اس حوالے سے بالکل درست تھیں، سو شانی نے بے
ساختہ چونک کر پوچھا۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“

”ہم سب کی خبر رکھتے ہیں۔“ وہ قفاخر سے مسکرا کر بولی۔ ”اسی لیے تم کا کہہ رہے ہیں کہ جو چاند چڑھانے
کا تم سوچتی ہو، وہ تو ہو گا نا ہی۔۔۔۔۔ اس لیے اب شریف لڑکیوں کی طرح بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دوئے۔۔۔۔۔ ورنہ
پچھتاؤ گی۔“

یہ سچ تھا کہ ندیم نے اسے خط لکھ کر اپنے جذبات سے آگاہ کرتے ہوئے اس سے رشتہ لانے کی اجازت
طلب کی تھی۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ ندیم کا یہ اظہار اسے بھا گیا تھا سو اس نے ندیم کی بہن اور اپنی سہیلی عاشری کو پیغام

بہجئے کے حوالے سے مثبت جواب دیا تھا۔ مگر اس کی نوبت ہی نہ آ سکی اور ان دو سچائیوں کے درمیان زمانہ حائل ہو گیا۔ اور اس کے دل کی خواہش اپنی جگہ پر زمانے سے ٹکر لینے کا نہ اس میں حوصلہ تھا اور نہ ہی ایسا کرنے کا ارادہ کہ وہ ایک روایتی مشرئی سوچ کی پروردہ تھی جہاں لڑکوں کو ہر سیاہ سفید کرنے کی آزادی اور لڑکیوں کے لیے متعدد سوال نشان ہوا کرتے ہیں۔

”پھر اس رشتے میں کوئی عیب بھی تو ہونے۔“ بالی کی تقریر جاری تھی۔ ”تو ہم لوگ تھرے انکار پر غور کر رہی ہیں۔ امی کتنا پریشان ہیں تھرے خاطر تم کا دیکھی نہیں ہو؟“

یہ اس کے حراحتی خول کو لگنے والی آخری ضرب تھی۔ جس کے بعد اس نے بنا کچھ کہے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆

”بس شریفہ کیا تاؤں مگر میں اتنی مصروفیت ہوتی ہے کہ ٹکلتا ہی نہیں ہوتا۔“

پچن کا جیش قیمت گلابی جو ازب تن کیے؟ کندھے تک آتے تراشیدہ بالوں کو تازہ بہ تازہ رگھوائے، دھوپ کا چشہ دائیں ہاتھ سے اتار کر، سامنے میز پر رکھنے کے بعد، بڑے انداز سے مقابلہ برائمان، مشرق تا مغرب سرت سے باچھیں چیرے، خیر مقدمی انداز سے انہیں دیکھتیں شریفہ سے مخاطب ہونے والی یہ شخصیت مہربان تھیں۔

شریفہ کی خالہ زاد جو آج بڑے عرصے بعد ان کے ہاں وارد ہوئی تھیں۔ اور جنہیں اپنے روبرو پاکر شریفہ خوشی سے پھولی نہ ساری تھیں۔

اپنے رشتے داروں کی آمد پر وہ بولیں بھی کل کر گلاب بن جایا کرتی تھیں پھر آج تو بات بھی ذرا دوسری تھی تبھی وہ کل کھلا کر نہ صرف تازہ ”گل دسہ“ بنی ہوئی تھیں بلکہ ہاتھ پر تیز تیز اثبات میں ہلا کر تانید ابولی بھی تھیں۔

”سچ بتی ہو مہر، میں تو خود کئی ماہ سے تمہاری طرف آنے کا سوچتی ہوں تو بس سوچتی ہی رہ جاتی ہوں۔“

”چلو تم نہ ہی۔“ وہ سختی خیزی سے مسکرا کر بولیں۔ ”میں آگئی بات تو ایک ہی ہے۔“

”ہاں..... ہاں اور کیا بیٹا۔“ وہ پھر زور زور سے سر ہلا کر بولیں۔ پھر جھٹکا ٹانگہ ہوں سے مہمان خانے کے کھلے دروازے کی طرف دیکھ کر، پرودا میں جانب ڈرا سا جھکتی ہوئی سر گوشیادہ لہجے میں بولیں۔

”اجمعیہ تہاؤں سجاد کو اپنے ساتھ لے کر کیوں نہیں آئیں تم؟“

”ابھی سے لا کر کیا کرنا تھا۔“ وہ یک بیک بہت سنجیدہ ہی ہو کر بولیں۔

”سہلی مجھے اپنی ساس سے تو بات کر لینے دو۔“

”ان سے بات کیا کرنی ہے۔“ شریفہ نے کڑوے لہجے میں منہ بتاتے ہوئے کہا۔

”وہ تو اپنی نواسی کے لیے کسی ریاست کے شہزادے کی آس لگائے بیٹھی ہیں۔“

”ہاں تو میرا بھائی کسی شہزادے سے کم ہے کیا؟“ وہ قفاخر سے بولیں۔

”بہر حال تم اپنی بلوالو تو اچھا ہے تاکہ جو بات بھی کرنی ہے، میں انہی کے سامنے کر لوں۔“

”تمہاری آمد کی خبر کر آئی تھی میں انہیں۔“ شریفہ کچھ جڑی ہو کر بولیں۔

”بڑی بی کو بہت شوق ہے اس عمر میں بھی لوگوں سے مل کر باتیں بگھارنے کا بس آتی ہی ہوں گی۔ لو.....“

بولتے بولتے ان کی نگاہ دروازے سے خراماں خراماں اندر داخل ہوئی لیاقت بیگم پر بڑی تو ایک جتنائی سی نگاہ مہربانو پر ڈال کر بولیں۔ ”آئیں۔“

ان کے ساتھ ساتھ ہی لیمن اسکوٹش کے گلاس ٹرے میں رکھے عارف زری سے مسکراتی وہیں چلی آئیں۔

علیک سلیک اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد یہ بالا مہربانو، اپنی آمد کی اصل وجہ بیان کرنے کی خاطر لیاقت بیگم کو

مطالب کرتے ہوئے تمہیداً کہنا شروع کیا۔

”آپ تو جانتی ہیں خالہ۔ سجاد ہمارا سب سے چھوٹا بھائی ہے۔ ہم بہنوں نے بالکل بیٹے کی طرح پالا ہے اسے۔ امپورٹڈ انیسپورٹ کا بزنس کرتا ہے۔ بہت پیسا ہے اس کے پاس مگر بس مقدر.....“ انہوں نے بولتے بولتے ایک آہی بھری..... اور یک لحظہ توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئیں۔ ”اسنے ارمانوں سے ہم بہنوں نے اس کی شادی کی مگر اس کی دلہن بہت کم عمر لکھوا کر لائی تھی۔

”دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر بس چلی گئی اللہ کے پاس۔“

”ہاں بیٹی۔“ لیاقت بیگم اس طویل تمہید کا پس منظر بھانپنے بغیر سادگی سے بولیں۔ ”چلا تھا مجھے، بہت رنج ہوا تھا سن کر..... اللہ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے۔“

”آپ لوگوں نے بھائی کی دوبارہ شادی کے بارے میں نہیں سوچا؟“ عارف نے عام سے لہجے میں ایک روایتی سا سوال پوچھا تھا کہ جس کا بہت ہی خاص جواب ان کی پٹاری میں موجود تھا تب ہی خمبیر تاسے بولیں۔ ”دراصل وہ اس قدر صدمے میں تھا کہ راضی ہی نہیں ہو رہا تھا دوسری شادی پر وگرنہ ہم تو کب کی کروا چکے ہوتے۔ خیر دیر آید درست آید۔“ وہ مسکرائیں۔ ”اب مانا ہے تو میں بھی جلدی سے جھولی پھیلائے آپ کے ہاں چلی آئی۔“

”کیا مطلب بیٹی؟“ لیاقت بیگم نے بہت چونک کر ان سے استفسار کیا تھا۔ حالانکہ ان کا سوال واضح تھا مگر تھا کس کے لیے؟ اس بات نے انہیں اچھٹے میں ڈال کر سوال کرنے پر مجبور کر دیا۔

تب شریف نے گویا خود کو ہر قسم کے حالات سے نشنہ کے لیے تیار کرتے ہوئے اجازت طلب سوالیہ نظروں سے اپنی جانب دیکھتی مہراؤ کو بہت واضح اشارہ کیا سو وہ کھٹکھٹا کر اس بار بہت واضح الفاظ میں بولیں۔

”مطلب یہ خالہ کہ میں آج سجاد کا رشتہ بدلتی کے لیے لے کر آئی ہوں۔ امید ہے آپ انکار نہیں کریں گی۔“

☆☆☆

”ہے کوئی طلب گار کہ میں اسے عطا کروں؟“

مہیب تاریکی میں غرق زمین کا ہر ذرہ جیسے خواب غفلت میں ڈوبا ہوا تھا، اور رات کے اس مجید بھرے آخری پہر، پہلے آسمان سے ندا کی جاری بھی ہے اور بات کما سے سن پاتا ہر ساعت کا مقدر نہیں تھا۔ ہاں مگر چند..... جن میں سے ایک وہ بھی تھی۔

خند تو خمر یوں بھی اس کی ”بھیری“ تھی پر آج تو لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے بھاری پپٹوں میں میخیں گاڑ کر انہیں بند ہونے سے روک رکھا ہو۔ من جو یوں بھی بے گل رہتا تھا، آج اس کی بے قراری حد سے سوا بھی۔ آج وہ جیسے خود سے مکمل لائق کا اعلان کر دیتا جا رہی تھی۔ مگر اس سے کیا ہوتا؟ کیا اس کے اس اعلان لائق سے راہ گہ ہوجانے والی صورتیں واپس اپنی سابقہ حالت میں آ جاتیں؟

یا پھر اس کے جیون پر چھا جانے والی اماؤس، چاندنی رات سے بدل جاتی؟

”ہے کوئی طلب گار کہ میں اسے عطا کروں؟“

کمرے میں زیر پاؤر کی ٹیلی جی روشن تھی اور وہ بی۔ ڈی کے پنگ سے قدرے قاصطے پر، زمین پہ جائے نماز بچھائے، جگہ سے میں پڑی کر لارہی تھی۔

”ہاں میرے رب میں ہوں طلب گار، ہر اس خیر کی جو تو نے اس زمین پر اتارا ہے اور جو اس جہاں میں موجود ہے۔“

”ہے کوئی طلب گار.....“

”اور میں تجھ سے اپنے ہر گناہ کی معافی طلب کرتی ہوں۔“

”ہے کوئی.....“

”خواہ اس کا تعلق تجھ سے ہو یا..... باجمہر تیرے بندوں سے۔“

”بندوں کا حق تو بندے ہی معاف کر سکتے ہیں۔“

اس بار آسان سے نہیں، بلکہ کوئی اس کے من بھیتے سے بولا تھا۔ وہ جو جبرہ ریڑھی دفعتاً اٹھ بیٹھی۔

”ہاں.....“ وہ سراپکی سے بے آواز بیڑیائی۔ ”بندوں کا حق تو بندے ہی معاف کر سکتے ہیں.....“

بندے ہی معاف کر سکتے ہیں۔ ”اس کا بی چاہا، وہ اپنا سر نہیں بچ کر جان دے کر۔“

”اسے لڑکی.....“ لی۔ ذی نے نیم غنودہ سی آواز میں اسے پکارا تھا۔

”مجھے پورین پاس گناہ سے میری ہیلپ کرو۔“

اس پہلے اس پر انکشاف ہوا کہ جان دینا اتنا سہل کب تھا کہ اسے تو ابھی مزید ایڑیاں رگڑنا تھیں۔

☆☆☆

”مہندی لگا کر دکھنا، ڈولی سجا کے رکھنا۔“

وہ تادیروں ہی کھڑا اس نظروں سے اس گھر میں جاری تقریب کو دیکھتا گیا، تاہم ایک بزرگ تشویش زدہ سے ہو کر اس تک چلے آئے اور اس طرح یہاں کھڑے رہنے کا جواز طلب کیا۔

اب وہ بھی کیا کرتے کہ کسی کے ماتھے پر تو اس کا ارادہ درج ہوتا نہیں۔ بہر کیف وہ ان بزرگ کی تسلی کروا کر، جڑنے والے نئے رشتے کو خصوصی دل سے دھامیں دیتا آگے بڑھ گیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھر کر دو چار گھیاں عبور کیں جب ہی نگاہ کے سامنے غلامانے کے صحن درمیان واضح کھیل کا میدان آ گیا۔

اور اس میدان سے اس کی کسی ہی یادیں وابستہ تھیں۔ چند بہت خوش کن اور کچھ ناخوش گوار۔

اس جگہ سے جڑی آخری یاد کو وہ کس خانے میں جگہ دے۔ فی الوقت وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ عامر نے اپنی مہندی کی تقریب مشترک کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جس پر ایک ذرا سا اعتراض شونا کے شوہر نام دار اور شا کرنے نے اٹھایا کہ اس خالعتا گھر بیٹا نے پر منعقدہ تقریب کا مشترک انعقاد کچھ نامناسب یوں ہے کہ ان کے ہاں ہی خواہمیں بے پردگی کے باعث غیر آرام دہ محسوس کریں گی مگر۔

ان دونوں ہی کا یہ جائز اعتراض اس نے چکیوں میں اڑا دیا تھا۔ شا کر تو پہلے ہی اپنی عزت اپنے ہاتھ کے محمد ابق اس کے پیش تر محاطات سے کنارہ کش ہو چکے تھے، سو اس من مانی کے بعد انہوں نے آئندہ کم از کم اس کے حوالے سے مکمل لاپرواہی رہنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

یوں اب محلے کے اس میدان میں اس کی مہندی کی تقریب جاری تھی۔ انتظام سارا اس نے کروایا تھا مگر اس وقت ساری تقریب میں رہتا کہ گھر والے انتظامات کے حوالے سے خود اپنی تعریفیں کرتے بھر رہے تھے اور بلا مبالغہ ہر جگہ چھانے ہوئے تھے جب کہ لڑکے والے ایک کونے میں بیٹھے سامنے جاری تماشا خانہوشی سے دیکھ رہے تھے۔ جہاں دھڑکنے تمام ہمشیرگان اس فلمی گیت پر رقص پیش کر رہی تھیں۔ جی تو گوئے کے سنہری کام سے مزین زرد ساڑی میں لپٹی بالی کا بھی بہت چل رہا تھا مگر وائے مجبوری۔

سو سب سے آگے کرسی ڈالے بیٹھی..... زور زور سے تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی پراکتفا کر رہی تھی۔

”پردہ مینا۔“ نغمہ تبدیل ہوتے ہی ہمشیرگان نے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہوئے سبز اور زرد گھما گھما چوٹی پہنے لباسا جالی دار دوپٹہ چہرے پر گرائے دہن کو درمیان میں بچھ لیا تھا۔

اور اس کے بعد دولہا کو۔
 ”اوائے ہوئے۔“ ان دونوں کے ”ڈانس فلوز“ پر اترتے ہی ریٹا کے گھر والوں نے نعرے بازی شروع کر دی تھی۔

بے ہودگی، ہل بازی، طوفان بدتمیزی اور.....

”اوائے بیٹی۔“ وہ جو عثمان کو اس تقریب میں مدعو کر کے شرم سار سا ایک کونے میں، عثمان ہی کے ساتھ خاموشی سے کھڑا تھا ٹوٹی کے کندھے پر ہاتھ مار کر متوجہ کرنے پر اس کی جانب گھوما۔
 ”میں کل ٹائیک والے گانے پر ڈانس کرنے والا ہوں۔“ اس نے دانت نکوس کر ایک اہم اطلاع اسے دے کر اسے مدعو کرتے ہوئے کہا۔ ”تو بھی آ جا، ساتھ مل کر آگ لگا دیں گے۔“
 ”شکر یہ۔“ وہ چڑ کر خشک لہجے میں بولا۔ ”تم جاؤ میں یہیں ٹھیک ہوں۔“
 ”یاب تمہارے رشتے دار ہیں بیٹی۔“ ٹوٹی کے کندھے اچکا کر آگے بڑھتے ہی اس کے ساتھ کھڑا عثمان غیر معمولی خجندی کے ساتھ بولا۔ ”اور کتنے دن ان سے بدخبری برت سکو گے؟“
 یہ سوال تھا یا اعتماد؟ اس وقت بیٹی کچھ نہیں سکا تھا۔

☆☆☆

”آخر مہر و نال کی ہمت ہوئی کیسے دو بچوں کے باپ کا رشتہ ورنی کے لیے لے کر آنے کی؟“
 سجاد کا رشتہ نہیں، گویا کمر بھر میں بوجھ نچال آ گیا تھا۔ ان کا مدعا جان کر لیاقت بیگم اس وقت تو مارے صدمے کے حقیقتاً ٹپک ہوئی تھیں۔ مگر بعد میں جب شریفہ بڑھ چڑھ کر اس رشتے کے لیے انہیں ہموار کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں تب ان کے بے پروا دلائل کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کی طبیعت بگڑ گئی۔ جس کے بعد ظاہر ہے کہ سارے ہی گھر والوں کے علم میں یہ بات آ گئی۔ مفتاح اس لمحے گھری پر تھا سو لیاقت بیگم کو گھر میں ہر وقت کھڑی رہنے والی ”کھٹارا“ میں عارفہ کے ہمراہ وہی لے کر نزدیکی اسپتال بھاگا تھا۔
 یوں بار بار فشار خون کا خطرناک حد تک بڑھ جانا ڈاکٹر کے نزدیک اچھی علامت نہیں تھی۔ اور پھر ان کی ضعیف العمری بھی معاملات کو حد پر پیچیدہ بنا سکتی تھی اور بنا بھی رہی تھی۔ بہر کیف!
 رات بھر گھرنی میں رکھ کر انہیں اگلے دن ڈیڑھروں ادویات اور پرسکون رکھنے کی نصیحتوں کے ہمراہ گھر روانہ کر دیا گیا تھا۔

گوشت عافیت میں اب عافیت نہیں بلکہ وحشت و پابست — قصاں تھی۔

عارفہ، راجا کی مدد سے معطل کی لیاقت بیگم کو کمرے میں لے جا چکی تھیں۔ ان کے کمرے میں جاتے ہی مفتاح جو پیشکل تمام اب تک ضبط کی طنائیں تھا مے ہوئے تھا، باورچی خانے سے چائے کی پیالی پکڑے ہوا مدھونے ہوئی شریفہ کو سامنے دیکھتے ہی جیسے خود پر ضبط کھو بیٹھا تھا۔
 ”ہمت ہی ہے اس کی جو اس گھون کی پوری کے لیے سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اتنا اچھا رشتہ لے کر آ گئی۔“

وہ لیاقت بیگم کی حالت پر متاسف تھیں، نہ اپنی حرکت پر شرمندہ..... بلکہ بگڑے تیور بتا رہے تھے کہ اس بار انہوں نے یہ معاملہ آریا بار کرنے کی قسم کھا رکھی ہے، تب ہی زہر خندے لہجے میں بولیں۔

”رشتہ واقعی اگر اتنا اچھا ہے تو آپ داخلہ کی کیوں نہیں کر دیتیں؟“ اس نے اپنی دانست میں والدہ کے دل پر ضرب لگانے کی کوشش کی تھی مگر۔

”کبواس بند کر تو اپنی مفتاح۔“ وہ پھر گئیں۔ ”میری معصوم بیٹی کے لیے کیا وہ رنڈوا ہی رہ گیا ہے؟“

☆☆☆

”سر..... اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

امیر علی خان کو انجانا کانا ایک ہوا تھا، سو وہ گزشتہ دو ہفتوں سے طبی رخصت پر تھے۔ قاروق احمد کی ذمے داریاں ان کی غیر موجودگی کے سبب دو چھ ہو گئی تھیں سو وہ بس ایک مرتبہ اسپتال میں کمرے کمرے سے ہی ان کی عیادت کو جاسکتا تھا۔ البتہ بذریعہ فون ان سے مسلسل رابطے میں تھا، پر وہ ہر دو تفصیلی ملاقات کا موقع نہیں آج جا کر میسر آتا تھا۔

یوں اس وقت وہ ان کے چھوٹے بکرویدہ زیب گھر کے مختصر سے لان میں پڑی ہری اور سفید چیک دار غلاف والی آئرن راڈ کی چار کرسیوں میں سے ایک پر امیر علی خان کے بالمقابل وردی کے بجائے جمیر اور شرٹ پہنے بیٹھا ادب سے ان کی احوال پرسی کر رہا تھا۔

”اللہ کا بہت شکر ہے۔“ بلکہ نیلے سونی شلوار قمیص میں نیلوس، امیر علی خان کا سرخ و سپید چہرہ گو بیماری کے سبب کچھ کلاسا گیا تھا، تاہم وہ بشارت سے بولے۔ ”اب بہت بہتر ہوں۔“ یہ تو تہماری بھالی نے مجھے زبردستی گھر پر روک رکھا ہے ورنہ میں تو پچھلے ہفتے ہی راجیوان کر چکا ہوتا۔“ وہ لطیف سے لہجہ میں کہے گئے تو قاروق احمد مسکرائے لگا۔

”ہائی کماڈ کی بات مان لینا ہی دانش مندی ہے سر۔“ وہ جہنم لہجے میں بولی۔ ”یہ بات آپ ہی نے تو مجھے سکھائی تھی۔“

”ہا ہا ہا.....“ وہ بڑے دنوں بعد بہت دل سے ہنسے تھے۔

اسی وقت ان کا جزیقی ملازم، میز پر جانے سے پہلے لوازما ت چن گیا تو امیر علی خان آداب میز بانی نبھانے میں مصروف ہو گئے۔ پھر کچھ دیر بعد انہی یکم کے ہاتھ کی بنی حمرے داری دم والی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فاروق احمد سے پوچھنے لگے۔

”سہ بتاؤ ایک مین کہ تمہارا وہ ”مشن“ کہاں تک پہنچا؟“

”اب تک تو کہیں نہیں۔“ وہ چوں کہ جانتا تھا کہ وہ کس مشن کی بابت دریافت کر رہے ہیں سو یک سنجیدگی اختیار کرتا ہوا بولا۔

”یہ امید ہے کہ میں اسے جلد منزل پر پہنچا دوں گا۔“

”ویری گڈ.....“ امیر علی خان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”کوئی لیڈ ملی ہے؟“

’ایک بظاہر مجہول سا شخص ہے شرر۔‘ وہ پیشہ ورا نہ لہجے میں بتانے لگا۔ ’ان دنوں وہ آتش کا مرکز نگاہ

”اچھا ٹھیک ہے۔“ اس کے رویے میں درآئی تبدیلی کی وجہی الوقت وہ جانے سے قاصر تھا، سو پہلے کی بہ نسبت بچے بچے سے کچھ میں بولا۔ ”جار ہا ہوں..... رات تمہارا انتظار کروں گا۔“
پھر اس کا انتظار، انتظار ہی رہا کہ وہ رات بھی آئی ہی نہیں..... ہاں مگر ایک روز..... یوں ہی..... سر راہ..... جب اس سے ملاقات ہوئی تو.....

”عیسیٰ!..... اس نے پکارا.....
”عثمان!“ وہ پکار کی سمت کھوا ضرور مگر آج اس کے اعزاز میں پہلے کی گرم جوشی مفقود تھی.....
”کیسے ہو؟“ وہ غریب آیا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے چٹلون کی جیب میں ہاتھ ڈال لیے۔
”کیا گر رہے ہو آج کل۔“ اس نے غور سے اس کا ہمہ وقت سنجیدہ رہنے والا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔
”کر رہی رہا ہوں کچھ نہ کچھ۔“ اس نے نہ بتایا کہ اس کے حساب سے ان دونوں کے مابین ایسا کوئی رشتہ موجود نہ رہا تھا۔

”مجھ سے نہیں پوچھو گے کہ میں کیا کر رہا ہوں۔“ وہ بولا۔
”نہیں۔“ وہ اب اجنبیت سے دوسری جانب دیکھنے لگا تھا۔
”عیسیٰ!“ وہ اداسی محسوس کرتا ہوا بولا۔ ”بعض اوقات انسان جاہ کر بھی کوئی رشتہ قائم رکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا کہ کاش میں اپنی مٹی کی گوتہارے عاصر بھائی کی شادی میں لے کر نہ آیا ہوتا مگر میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔“
”ہاں.....“ اسے اتنے عرصے بعد اس کی کسی بھی بات سے کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ سوا ایک بے تاثر سا ہنکارا ابھر کر رہ گیا۔

یہ تک نہ پوچھا کہ ہماری دوستی کا عاصر بھائی کی شادی سے کیا تعلق..... پر بلا واسطہ ہی سہی پر ایک تعلق تو بہر حال تھا ہی۔ سو وہ بنا پوچھے از خود بتانے لگا۔
”میرے بڑے بھائی نے تمہاری بھائی کے گھر والوں کو شادی میں دیکھا تو بتایا کہ ان کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے..... اور وہی بدنامی جلد یا بدیر تمہارے گھر میں بھی ضرور پھیلی داخل ہوگی سو.....“ عثمان نے اتنا کہہ کر عیسیٰ کا چہرہ دیکھا جو ساٹ تاثرات لیے ہنوز دوسری جانب دیکھنے میں مگن تھا۔

”سو انہوں نے مجھے تم سے دوستی ختم کر دینے کا حکم دیا تھا۔“
”کتابی باتیں تو تم بہت کیا کرتے تھے۔“ وہ خاموش ہوا تو عیسیٰ نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے اس عرصے میں پہلی بار بے ساختگی سے لب کشائی کی..... ”تم ان سے یہ نہ کہہ سکے کہ کسی اور کے عمل کی سزا مجھے کیسے دی جا سکتی ہے؟“

اور اس جیسے سوال کا جواب عثمان کے پاس نہیں تھا سو عیسیٰ نے ایک شکوہ کناں، اداس سی نگاہ اس اجنبی بن جانے والے ہم دم دیرینہ پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا.....
بھی مڑ کر نہ دیکھنے کے لیے!

☆☆☆

”کل کلاں تمہاری دادی کو کچھ ہو گیا، تو کون اس بوجھ کو ڈھونڈتا پھرے گا۔“
ورگی اس وقت اسپتال سے لوٹنے والی لیاقت بیگم سے ملنے کی غرض سے نیچے اترنے ہی لگی تھی، کہ تب ہی نیچے والے لاؤنج میں مقاف اور شریفہ کے مابین جاری بحث نے اس کے بڑھتے قدم جہاں کی تہاں ساکت کر دیا۔

کر دیے تھے۔ شریفہ کا لہجہ نیا تھا، نہ ہی اس کے لیے ان کے لبوں سے نکلنے والے تلخ الفاظ میں کوئی جدت مگر وہ پھر بھی نئے سرے سے زخم زخم ہو گئی۔

کہنے والے کہہ جاتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ سہنا جان جو کھوں کا کام ہے۔ وہ اس وقت اتنی بددل ہو گئی تھی کہ پھر شام تک نیچے ہی نہ گئی۔

پھر مغرب کے بعد، لیاقت بیگم ہی کے طلب کرنے پر وہ نیچے اتری تھی۔ وہ تو اسے اپنے پاس ہی سلاتا چاہتی تھیں مگر ورنہ، ساری رات ان کی تمارداری کے محض خیال ہی سے گھبرا کر سہولت سے انہیں صبح گرتی واپس اُپر چلی گئی۔ اور جاتے جاتے اپنے ذہن پر رلتے ہوئے ہم راہ ان کی پوڑھی آنکھوں کی نیند بھی باندھے لے گئی تھی کہ شریفہ کے اس کاٹ دار مگر حقیقت پر مبنی جملے نے لیاقت بیگم کو بھی کھلی آنکھوں سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

انہیں جو فیصلہ کرنا تھا اب جلد کرنا تھا کہ آثار شاہد تھے۔

وقت اب کم رہ گیا ہے۔

☆☆☆

”ہیلو مائے انشا فیہم۔۔۔۔۔ ہاؤ آر یو آل؟“

شرز نے جو اسے سوکھل میڈیا پر پہلے کی طرح متحرک ہونے کا جو مشورہ دیا تھا، وہ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد بلا خرمائے کا فیصلہ یوں کر لیا کہ وہ اب اس بستر پر مسلسل بڑے بڑے دھت زوہی ہو رہی تھی۔ مگر آتش نے اس کے علاج معاملے میں کوئی کسر نہ اٹھا رہی تھی مگر بہتری اس میں پھر بھی نہیں آ پار ہی تھی اور یہی حقیقت اسے یک گونہ خوف و ہراس کی میں جلا کر رہا تھا، اور اپنے اسی ہراس پر قابو پانے کے لیے اس نے اپنا ذہن کہیں اور لگا دینے کا ارادہ کر لیا تھا، یوں وہ اس وقت انشا پر براہ راست تھی۔

”اوہ بی۔ ڈی کتنے دن بعد آپ کو دیکھا۔“

”طبیعت کیسی ہے آپ کی؟“

”کہاں گم ہیں اتنے دن سے؟“

دھڑا دھڑا اسکرین پر نمودار ہوتے کمٹس دیکھ کر اس عرصے میں۔

پہلی بار اسے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے اندر کے خوف کو بچھاڑ دے گی۔ تب ہی ایک دہی دہی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھونے کی سعی کی۔

”مائی ڈیر انشا فیہم۔۔۔۔۔ وہ جیتا اپنے لیے ان سب کو فکر مند دیکھ کر دل گداز سی ہو کر کہہ رہی تھی۔“ اپنے لیے آپ سب کا Concern دیکھ کر مجھے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ اب میں بہت بہتر ہوں۔“

”بہتر ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو جا کر، یہاں پر تماشا گاہ کر بیٹھ گئی ہو۔“ تب ہی اچانک اللہ کے کسی بندے نے اسے اپنے تئیں صحت کرنے کی کوشش کی۔

”اور کہا، اللہ نے ان کی جان بچالی مگر ان کی وہی حرکتیں ہیں۔“

وہ جو بھولا برس انجم اس کے ہونٹوں پر آنے کو تھا، وہ ان چند دل شکن الفاظ نے ناراض کر دیا۔

”لاکھوں روپے چہرے پر لگانے والی کایہ ہے اصل چہرہ ل۔۔۔۔۔“

کسی نے مسخرانہ کہا تھا۔

”کیا ہوا ہے میرے چہرے کو؟“ اس نے فریٹ کمرے کی بدولت اسکرین پر دکھائی دیتا اپنا چہرہ دائیں

ہاتھ سے بری طرح ٹٹولا۔۔۔۔۔

”گڈ ٹو سی یو بیک بی۔ ڈی۔“

”وی آرڈیننگ فار یور نیو بچر۔“

”جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“

”غلط ہے چاری کو ظم سے لگ آؤٹ کروایا تھا، اس کی سزا۔۔۔۔۔“

بے درپے موصول ہونے والے بھانت بھانت کے مہکس پڑھتی بی۔ ڈی کے مرتش ہاتھ سے فون، یہ کھٹ پڑتے ہی چھوٹ کر گود میں جا گرا۔ کہ یہ اس کے پہلے ہی سے شکستہ اعصاب کے برداشت کی حد تھی۔

”وہ میرا بچہ کیوں نہیں چھوڑ دیتی۔۔۔۔۔ وہ میرا بچہ۔“

چند ٹاپے بعد، اس کی ہڈیالی جینوں سے پورا کرہ گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

”عیسیٰ۔۔۔۔۔ میری بات تو سنو۔“

آپس میں مشاورت کے بعد ان لوگوں نے آنے والے اتوار کو عیسیٰ کا رشتہ اس لڑکی کے گھر لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔۔۔۔۔ رنجی چوں کہ اس فیصلے سے غیر مطمئن تھی، سو اگلے روز عیسیٰ سے صاف صاف بات کرنے کی غرض سے پھر چلی آئی تھی۔ اسے ایک بار پھر ”اپنے دروازے“ پر دیکھ کر دینا جبر ضرور ہوئی تاہم کچھ بھی بولے بتائیں طبیعت خرابی کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں پڑ گئی کہ آج آداب میں زبانی سنبھالنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

”میں کو بھی اپنی خاطر مدارت کروانے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی سو وہ بھی عیسیٰ ہی کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ ٹیوشن پڑھانے کے لیے نکل رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے دیکھ کر صدمہ کا ضرور مگر علیک سلیک کے بعد تنجید کی سے کمرہ عبور کرنے ہی لگا تھا کہ عیسیٰ نے سرعت سے آواز دے کر روک لیا۔۔۔۔۔

”جی؟“ وہ ناچار زخمی تو ضرور کیا مگر اس کی جانب گھوما نہیں۔

”دیکھو آرام سے بیٹھ کر بولت سے مجھے بتاؤ۔“ وہ جتنا الفاظ کا چننا ڈکرتی ہوئی بولی۔ ”کہ اصل معاملہ ہے

کیا؟“

”آپ کو عام بھائی اور ان کی بیوی نے نہیں بتایا۔“ وہ مڑے بتاتی عجیب انداز سے بولا تو کچھ دیر کے لیے وہ بالکل خاموش رہ گئی۔ پھر یک لخت توقف کے بعد آہستہ سے بولی۔

”بتایا ہے، مگر میں تم سے سنتا چاہتی ہوں۔“

”تاہم پاس کے اور بھی کئی طریقے موجود ہیں۔“ وہ بے چلک سے لہجے میں بولا تو تنگی افسردہ ہو گئی۔

”عیسیٰ۔۔۔۔۔ آخر ہو کیا گیا ہے تمہیں؟“

”پاگل ہو گیا ہوں میں۔“ وہ زخمی لہجے میں بولا۔ ”مجھ سے بات مت کیا کریں۔“

”بات نہیں کریں گے کہ تو یہ مسئلہ حل کیسے ہوگا؟“

”میرا مسئلہ ہے، میں حل کر لوں گا۔“ وہ اجنبیت سے بولا۔

”ایسا نہیں ہوتا عیسیٰ۔“ وہ اس بار کچھ نکلی سے بولی۔ ”مگر، خاندان بھائی بہنوں کی اہمیت باقی ہے۔“

”میں بھی یہی سمجھتا تھا۔“ وہ متفر سے لہجے میں بولا۔ ”پر ”انجی“ نے مجھے غلط ثابت کر دیا۔“ اس نے سر

جھکا۔ ”خیر جانے دیں، آپ بس اسی بات پر یقین کر لیں جو عام بھائی اور ان کی بیوی نے آپ کو بتائی ہے۔“

”رشتہ لے جانے کا کہہ رہے ہیں وہ تمہارا۔“ عیسیٰ جو تاسف لگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، دھیرے سے

بتاتے گئی۔۔۔۔۔

”کیا؟“ وہ اس بات پر بے ساختہ اس کی جانب گھوما تھا۔

”ہاں.....“ وہ پریشان سے لہجے میں اسے آگاہ کرتی ہوئی بولی۔

”اس لڑکی کی ممانی کا فون آیا تھا۔ رشتہ نہ جوڑنے کی صورت میں عینکین منہج کی دھمکیاں دی ہیں..... دیکھو۔“ وہ بیٹی کے بے تاثیر چہرے سے الجھن محسوس کرتی ہوئی بولی۔ ”اگر وہ لڑکی انہیں پسند ہے تو پھر شادی کرنے میں کیا مسئلہ ہے؟“

”وہ لڑکی مجھے پسند ہے۔“ وہ پھر کبے ساختہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ ”خیر میں دیکھتا ہوں اس کا کیا کرتا ہے۔“

”کیا کرو گے؟“ بھی ٹکڑ مند ہوئی۔ ”مگر وہ بتا کچھ کہ اس کا ایک نظر اس پر ڈال کر وہ عیور کر گیا۔“

”تھی نے بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔“

☆☆☆

”جی ثانی بیگم، آپ نے مجھے بلایا تھا؟“

ایک تو دو دو چار روز سے سہراب خدا معلوم کہاں غائب تھا کہ اس سے بار بار کوشش کے باوجود بھی رابطہ ممکن ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ستر اور نصف غایت میں ہوئی کشیدگی میں روز بروز ہوتا میخاف..... وہ جیٹا مضطرب و بکھلائی ہوئی سی گئی کہ نا جانے حالات کب، کون سا رخ اختیار کریں۔ ابھی بھی وہ میز پر محفل سی کھڑی سامنے دیکھے بھی سب سوچے چلی جا رہی تھی کہ میرا اس لیاقت بیگم کا چاہوے کہ خاموشی سے پلٹ گیا..... کوئی اور وقت ہوتا تو.....

بہر کیف وہ اس وقت لیاقت بیگم کے بلاوے پر ان کے کمرے میں داخل ہوئی ہوئی مستحضر لافانی سے بولی تھی۔

”ہاں بیٹی.....“ وہ جو سر پر نماز کے سے انداز میں دوپٹے اوڑھے، جنگ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز، صبح بھیرتی ہوئی زرد و خیف چہرے پر ٹھگرواں محال لیے کسی غیر سر کی نقطہ پر نظریں جمائے ہوئے تھیں، اس کی آواز پر چوتھے ہوئے، اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔ ”آؤ..... یہاں بیٹھو آ کر..... میرے پاس۔“ انہوں نے اپنے نزدیک جگہ بنائے ہوئے بہت شفقت سے کہا تو وہ جیسے بادل خواستہ وہاں جا بیٹھی۔

”تم جانتی ہو زہرہ کے بعد میں تمہیں دیکھو کہ کب کب جیتی تھی۔“ چند لمبے سنی خیر سی خاموشی دونوں کے مابین چھائی رہی، بلا غریباقت بیگم کو یا اپنی ساری ہمت جمع کرتی ہوئی بولی تھیں۔

”جی.....“ وہ جو غیر دل چسپی سے ان کی جانب متوجہ تھی، ہر خود والدہ کے ذکر پر افسردہ خاطر سی ہو گئی۔

”خدا گواہ ہے کہ میں نے پوری دیانت داری سے تمہاری ذمے داری نبھانے کی کوشش کی مگر نہ جانے۔“

یہاں تک آتے آتے ان کی آواز لڑکھرائی گئی۔ ”نا جانے مجھ سے کہاں چوک ہو گئی۔“

وہ ان کی اس بات پر خاموش ہی رہی کہ کبھی بھی کیا آخر.....

”بہر حال.....“ چند لمبے خود پر قابو پانے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ ”حالات اگر غیر معمولی ہو جائیں

تب انسان کو بحالت مجبوری مشکل فیصلے کرنے پڑ جاتے ہیں۔ بہو بیگم ٹھیک ہی کہتی ہے۔ میں چراغِ محری ہوں..... اب سمجھی کہ جب..... اور اسی لیے میں نے تمہیں.....“ وہ اتنا کہہ کر پھر یوں خاموش ہو گئیں جیسے حرید

کہنے کا حوصلہ خود میں نہ پائی ہوں..... پر ان کی اس سنجیدہ تمہید نے ورثی کے اوسان خطا کر دیے تھے سو بے چینی

سے آگے جانے کی خاطر بولی۔

”آپ نے مجھے؟“

”ہاں بیٹی.....“ وہ ایک نظر اس کا محصور چہرہ، بہتی آنکھوں سے سے دیکھ کر دل کڑا کر کے بلا خربو لیں۔

”میں نے تمہارے والد سے رابطہ کر کے تمہیں اس کے پاس بھجوانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

(بائی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)